ی

ی (ضمیر)

یِ۔ ضمیر مجرور متصل ہے۔ واحد متکلم (مذکر اور مؤنث دونوں) کیلئے آتی ہے۔ غُلَامِیْ۔ میرا غلام۔ نیز ضمیر منصوب متصل۔ جیسے یَعْبُدُوْنَنِیْ۔ کبھی یہ ی مفتوح بھی ہو جاتی ہے۔ جیسے نِعْمَتِیَ الَّتِیْ (۲/۴۰)۔ اور کبھی حذف بھی ہوجاتی ہے۔ مثلاً وَلِیَ دِیْنِ (۱۰۹/۶)۔ میرے لئے میرا دین (یہاں دِیْنِ کے بعد ''ی'' حذف ہوگئی اور ''ن'' پر صرف زیر رہ گیا۔)

یَا (حرف)

یَا۔ حرف نداء۔ پکارنے کے لئے آتا ہے۔ ''اے'' کے معنوں میں۔ یَا اَرْضُ ابْلَعِیْ (۱۱/۴۴) اے زمین تو نگل لے۔ یہ حرف نداء عموماً حذف بھی ہوجاتا ہے۔ جیسے رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا (۲۱/۸۹)۔ (اے) میرے رب مجھے تنہا نہ چھوڑیو۔ (یہاں رَبِّ سے پہلے یَا محذوف ہے) یَا کے بعد اَیُّھَا کا اضافہ بھی کر دیا جاتا ہے۔ جیسے یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا (۹/۲۸)۔ اے ایمان والو!۔

ی أ س

اَلْیَاْسُ۔ ناامید اور مایوس ہونا۔ یَؤُسٌ۔ یَئُوْسٌ۔ ناامید ہوجانے والا۔ اِسْتَیْاَسَ۔ ناامید ہوگیا*۔ سورہ یوسف میں ہے فَلَمَّا اسْتَایْئَسُوْا مِنْہُ (۱۲/۸۰) ''جب وہ اس سے مایوس ہو گئے''۔ اور وَلَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِنَّہٗ لَا یَایْئَسُ ...... (۱۲/۸۷)۔ اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ اس سے کافروں کے سوا کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

سورہ رعد میں ہے اَفَلَمْ یَایْئَسِ الَّذِیْنَ آمَنُوْا .... (۱۳/۳۱) اہل لغت نے کہا ہے کہ یہاں اسکے معنی اَفَلَمْ یَعْلَمْ کے ہیں۔ یعنی کیا

---

*تاج۔

انہوں نے اسبات کو جان نہیں لیا*۔ ابن فارس نے یہ معنی بھی بنیادی لکھے ہیں (یعنی جاننا) ۔ لیکن راغب کا کہنا ہے کہ یہ معنی مجازی ہیں**۔ سورہ ممتحنہ میں ہے قَدْ یَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَۃِ ..... (۶/۱۳) ۔ یہاں اس کے معنی انکار کرنے کے ہیں ۔ یعنی وہ انکار جو ناامیدی کا نتیجہ ہوتا ہے ۔

آپ سورہ یوسف کی اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جو اوپر درج کی گئی ہے ۔ اس میں آپ کو قوموں کے عروج و زوال کے متعلق ایک عظیم اصول ملیگا ۔ آیت ہے وَلَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ ۔ اِنَّہٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ (۱۲/۸۷)۔ ”اللہ کی رحمت سے نا امید مت ہو ۔ کیونکہ اللہ کی رحمت سے سوائے کافروں کے کوئی ناامید نہیں ہوتا“ ۔ اسی کو دوسری جگہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ (۳۹/۵۳) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (نیز ۴۹/۲۳)۔ اسلام کسی کو قنوطی (Pessimistic) نہیں بنانا چاہتا۔ مومن وہ ہے جو علیٰ وجہ البصیرت خدا کے قوانین کی محکمیت ، نتیجہ خیزی اور صداقت پر یقین رکھتا ہے ۔ وہ اس یقین کے ساتھ اس راستے پر گامزن ہوتا ہے ۔ اگر اسے کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے ، یا اپنی کسی غلطی سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے تو اپنی روش کی صداقت اور محکمیت پر یقین اسے بددل نہیں ہونے دیتا ۔ وہ سنبھلتا ہے ۔ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے اور اپنی غلطی کا ازالہ کرکے ، پھر اسی راستے پر چل پڑتا ہے ۔ یہ ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونے کا مفہوم ۔ ناامید وہ ہوتا ہے جو کسی راستے کو قیاس اور گمان پر تجربۃً اختیار کرتا ہے ۔ جب اُسے ناکامی ہوتی ہے تو وہ وہیں رک جاتا ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے سے نا امید ہو جاتا ہے ۔ لیکن جسے راستے کی صحت پر یقین ہو وہ کبھی نا امید نہیں ہوتا ۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے نا امیدی اور ابلیسیت کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے ۔ (دیکھئے عنوان ب ۔ ل ۔ س) ۔ لیکن خدا کی رحمت یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں مل جاتی ۔ اس کے لئے کہا ہے کہ وَادْعُوْہُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۔ تم دفع مضرت اور جلب منفعت ، دونوں صورتوں میں قوانین خداوندی کو آواز دو ۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (۷/۵۶) ۔ یقین جانو کہ خدا کی رحمت ان کے قریب ہوتی ہے جو حسن کارانہ انداز سے توازن بدوش زندگی بسر کرتے ہیں ۔

اسی میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے ۔ ایک شخص مصائب کے ہجوم میں گھر جاتا ہے جہاں سے نکلنے کی کوئی راہ اسے نہیں ملتی ۔ لیکن

*تاج ۔ **راغب ۔

وہ ہمت نہیں ہارتا ۔ دل نہیں چھوڑتا ۔ وہ اسے محض طبعی حالات کی مجبوری سمجھتا ہے ۔ اپنے اندر شکست خوردگی کا احساس نہیں پیدا ہونے دیتا ۔ یہ شخص "خدا کی رحمت" سے مایوس نہیں ۔ لیکن اگر وہ ایسی مجبوری کے عالم میں (یا جونہی کوئی مشکل سامنے آئے اسوقت) فیصلہ کر لیتا ہے کہ میں اس قابل ہی نہیں کہ اس کا مقابلہ کر سکوں یا اسے برداشت کر سکوں ، تو اس پر مایوسی چھا جائیگی ۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی ذات پر ایمان رکھتا ہے ، جسے خود اعتمادی حاصل ہے ، وہ کبھی مایوسی کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتا ۔ اسے اپنے آپ پر بھروسہ ہوتا ہے اور وہ اسی وجہ سے پرامید رہتا ہے ۔ لیکن جس شخص کا اپنی ذات پر ایمان نہیں رہتا ۔ جو اس سے انکار کر دیتا ہے ، وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے ۔ اس پر (Frustration) چھا جاتی ہے یہی چیز ہے جو بسا اوقات انسان کو خود کشی تک لے جاتی ہے ۔ خود کشی وہ کرتا ہے جس کی اپنی نظروں میں کوئی قیمت نہیں رہتی ۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرے زندہ رہنے میں میرا کچھ فائدہ نہیں ۔ وہ اپنی نظروں میں آپ گر جاتا ہے ۔ مادی نظریہ حیات (Materialistic concept of life) میں چونکہ سارا انحصار خارجی (مادی) اسباب و ذرائع پر ہوتا ہے اس لئے جب وہ اسباب ختم ہو جاتے ہیں تو انسان مایوس ہو جاتا ہے ۔ لیکن انسانی ذات کی ممکنات کی کوئی ۔

مقام پر بھی یہ نہیں کہتا کہ اس سے آگے میں کچھ کر سکنے کے قابل نہیں ۔ وہ یہ کہیگا کہ اس کے بعد سردست میرے پاس مادی وسائل نہیں رہے لیکن وہ اپنی ذات سے کبھی مایوس نہیں ہوگا ۔ کفر درحقیقت انسان کا اپنی ذات سے انکار — اور اس کے بعد مکمل ترین ذات خداوندی سے انکار ہے ۔ علاوہ بریں ، انسانی ذات پر ایمان سے انسان ، بلند اقدار کی ضرورت محسوس کرتا ہے جو اسے وحی سے ملتی ہیں ۔ اسی کی قوت سے وہ طبیعی مجبوریوں سے نہیں گھبراتا اور مایوسی کو کبھی اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتا ۔ حتکہ موت کا سامنا کرتے وقت بھی نہیں گھبراتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت سے اس کا جسم فنا ہوجائیگا لیکن اس کی ذات پر کوئی آنچ نہیں آئیگی ۔

آپ نے غور فرمایا کہ مایوسی کیوں کفر ہے ۔

يَاجُوجُ وَمَاجُوجُ

وہ اقوام جن کی یورشوں سے حفاظت کے لئے ذوالقرنین نے دیوار بنا کر دی تھی ($\frac{۹۸}{۹۴}$) تفصیل عنوان (ا - ج - ج) کے تحت دیکھئے۔

یاقوت

اَلْیَاقُوْتُ۔ یہ فارسی لفظ ہے جو عربی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ سخت اور صاف شفاف جواہرات جن کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ عموماً سرخ رنگ مراد ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے کَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ (۵۵/۵۸)۔ گویا کہ وہ (مؤنث) یاقوت اور مرجان ہیں۔

یٰلَیْتَ

یہ حرفِ ندا (یا) اور لَیْتَ کا مجموعہ ہے۔ اس کے معنی ہیں ''اے کاش'' (دیکھئے یَا اور لَیْتَ)۔

ی ب س

یَبِسَ۔ کسی مرطوب چیز کا خشک ہو جانا۔ اَلْیَبْسُ۔ وہ چیز جو پہلے تر ہو اور پھر خشک ہو جائے۔ شَاةٌ یَبَسٌ۔ اس بکری کو کہتے ہیں جس کے تھن خشک ہو جائیں اور وہ دودھ دینا بند کر دے *۔ اَلْیَبَسُ۔ وہ جگہ جہاں پانی ہو اور پھر جاتا رہے۔ تورات میں اَلْیَابِسَةُ خشکی کے لئے آیا ہے بمقابلہ بَحْرٌ کے **۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا (۲۰/۷۷)۔ بنی اسرائیل کو سمندر میں ایسے راستے سے لے جا جس پر پہلے پانی تھا لیکن جو اسوقت خشک ہے۔

سورۃ انعام میں ہے وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (۶/۵۹)۔ کائنات کی کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں (یا خشک و تر پھل ایسا نہیں) جس کے لئے ضروری قانون اور قاعدہ صحیفۂ فطرت (کائناتی قوانین کے ضابطہ) میں موجود نہ ہو۔

ی ت م

اَلْیُتْمُ۔ اکیلا اور تنہا رہ جانا۔ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ اصمعی نے کہا ہے کہ اَلْیَتِیْمُ اس ریتیلی زمین کو کہتے ہیں جو اپنے اردگرد کی زمینوں سے الگ تھلگ ہو۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ اَلْمُیْتَتِمُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تنہا اور اکیلی ہو۔ راغب کے نزدیک ہر منفرد

* تاج۔ ** محیط۔

اور تنہا چیز یتیم کہلاتی ہے*۔ دُرَّةٌ یَتِیْمَةٌ ۔ اس موتی کو کہتے ہیں جو اپنی نوعیت کا ایک ہی ہو۔

بن باپ کے بچے کو بھی یَتِیْمٌ اسلئے کہتے ہیں کہ وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ حرالی نے کہا ہے کہ ضرورت کے وقت باپ کا نہ رہنا یُتْمٌ کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک بچہ جوان نہ ہو وہ یَتِیْمٌ کہلاتا ہے، لیکن جب وہ جوان ہو جائے تو اسے یَتِیْمٌ نہیں کہتے ۔ اس کے برعکس لڑکی اُسوقت تک یَتِیْمَةٌ کہلاتی ہے جب تک اسکی شادی نہ ہو جائے ، خواہ وہ بالغ بھی کیوں نہ ہو چکی ہو۔ بہائم (حیوانات) میں یَتِیْمٌ ان بچوں کو کہتے ہیں جنکی ماں نہ رہے اسلئے کہ ان میں بچہ کی پرورش ماں کرتی ہے ۔ باپ کی انہیں احتیاج نہیں ہوتی ۔ برعکس اس کے اگر انسانی بچہ کی ماں مر جائے تو اسے یَتِیْمٌ نہیں کہتے ۔ مُنْقَطِعٌ یا عَجِیٌّ کہتے ہیں ۔ اگر ماں باپ دونوں مرجائیں تو اسے لَطِیْمٌ کہتے ہیں ۔ (یَتِیْمٌ کی جمع اَیْتَامٌ اور یَتَامٰی دونوں آتی ہیں) ۔ اِمْرَاَةٌ مُوْتِمٌ ۔ اس عورت کو کہتے ہیں جس کے بچے یتیم ہو جائیں۔ یعنی جس کا شوہر مر جائے*۔ لسان العرب میں ہے کہ یَتِیْمٌ اس عورت کو کہتے ہیں جس کا خاوند نہ ہو۔ یعنی خواہ مر چکا ہو یا ویسے ہی اس کا خاوند نہ ہو۔ قرآن کریم میں یَتٰمَی النِّسَآءِ ($\frac{4}{127}$) ایسی ہی عورتوں کے لئے آیا ہے ۔

یَتَامٰی کے ان معانی کو سامنے رکھئے اور پھر سورہ نساء کی اس آیت کو دیکھئے جس میں کہا گیا ہے کہ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتَامٰی فَانْکِحُوْا مَاطَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ . . . ($\frac{4}{3}$) ۔ اگر تم دیکھو (تمہیں اس کا خدشہ ہو) کہ تم "یتامٰی" کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں کر سکتے ۔ ان کے حقوق پورے نہیں ہو سکتے ۔ تو تم ان میں سے جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے دو۔ دو۔ تین تین ۔ چار چار تک سے شادی کر لو۔

ظہور اسلام کے بعد مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کو بے شمار لڑائیاں لڑنی پڑیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئیں ۔ بہت سے بچے لاوارث رہ گئے ۔ بہت سی بالغ لڑکیاں ایسی رہ گئیں جنہیں خاوند ہی نہیں مل سکتا تھا ۔ یہ ایک ایسی ہنگامی اور اجتماعی مشکل پیدا ہو گئی جس کا حل نہایت ضروری تھا ۔ یہ مشکل اس لئے تھی کہ

*تاج و محیط و راغب ۔

(۱) قرآن کریم کا عام قانون ایک عورت سے شادی کرنے کا تھا (فَوَاحِدَةً - ۴/۳)

(۲) مسلمان عورتیں نہ کفار سے شادی کر سکتی تھیں ، نہ مشرکین سے - نہ اہل کتاب سے - انہیں بہرحال مسلمان ہی سے شادی کرنی تھی - اور مسلمان مردوں کی تعداد اسقدر کم ہو گئی تھی -

اس ہنگامی مسئلہ کے حل کے لئے قرآن کریم نے وحدت زوج (Monogamy) کے قاعدے میں وقتی طور پر استثناء (Relaxation) کی اجازت دی اور کہا کہ ان عورتوں میں سے (اَلنِّسَآءَ - ۴/۳) جو اسطرح بے شوہر رہ گئی ہیں (خواہ بیوہ ہو کر - اورخواہ نا کتخدائی کی حالت میں جنہیں شوہر نہیں ملتا) - حسب پسند ، ایک سے زیادہ سے نکاح کرکے ان کی حفاظت کا سامان پیدا کر دو - یہی ان کے مسئلہ کا منصفانہ حل ہے - قرآن کریم میں بس یہی ایک آیت ہے جس میں تعدد ازدواج (Polygamy) کی اجازت ہے - اگر ایسے حالات پیدا نہ ہوں تو پھر قانون وہی ایک بیوی کا ہے -

یَتِمَ - یَتْمًا کے معنی کمزور اور ضعیف ہو جانا - قاصر ہو جانا اور تھک جانا - درماندہ ہو جانا - بھی ہوتے ہیں - نیز یَتْمٌ کے معنی فکر و غم کے بھی آتے ہیں اور دیر کرنے اور غفلت کرنے کے بھی - اسلئے کہ یتیموں کی خبر گیری میں غفلت کی جاتی ہے اور انہیں مدد پہنچانے میں دیر لگائی جاتی ہے - اَلْيَتَمُ کے معنی حاجت اور ضرورت کے بھی ہوتے ہیں* -

قرآن کریم میں یتیموں کی نگہداشت کے متعلق بڑی تاکید آئی ہے ، اور سرمایہ داری کے نظام کی تباہی کا سبب یہ بتایا ہے کہ لَا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (۸۹/۱۷) - ان آیات میں یَتِيْمٌ سے مراد وہی نہیں جنکے باپ مر چکے ہوں - اس سے مراد تمام وہ لوگ ہیں جو معاشرہ میں تنہا رہ گئے ہوں - جو بے یار و مدد گار ہوں - لہذا جس معاشرہ میں کسی فرد کو بھی یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ اکیلا ہے - اس کا کوئی مدد گار نہیں - اسکی مصیبت تنہا اس کی مصیبت ہے - اسکا کوئی مونس و غمخوار اور کوئی یار و مدد گار نہیں - وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے ، کیونکہ اس میں تنہا رہ جانے والے کو واجب التکریم نہیں سمجھا جاتا - قرآن کریم ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں کسی فرد کو اس کا احساس تک نہ ہونے پائے کہ وہ تنہا ہے - اس کا کوئی پناہ دینے والا نہیں - یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود نبی اکرم

*تاج و محیط و راغب -

سے کہا کہ اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْماً فَاٰوٰی (۹۳/۶) ۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اس نے تجھے یتیم پایا اور پناہ کا سامان بہم پہنچا دیا ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یتیم وہ ہے جو پناہ سے محروم رہ جائے ۔ اور ایسے شخص کے لئے پناہ کا سامان بہم پہنچانا اس معاشرہ کا کام ہے جو خدا کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوا ہو ۔

یحییٰ علیہ السلام

قرآن کریم نے حضرت یحییٰؑ کو منجملہ انبیاء بنی اسرائیل بتایا ہے (۶/۸۵) ۔ آپ حضرت زکریاؑ کے بیٹے تھے (۱۹/۷) ۔ صاحب کتاب اور بچپن ہی سے عمدہ قوت فیصلہ کے مالک (۱۹/۱۲) اور صفات حسنہ سے آراستہ (۱۹/۱۳-۱۵) ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انجیل میں جنہیں یوحنا کہکر پکارا گیا ہے وہ حضرت یحییٰؑ ہی ہیں ۔ انجیل (لوقا) میں "یوحنا" کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے کہ

> وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا اور اسرائیل پر ظاہر ہونے تک جنگلوں میں رہا (۱/۸۰) ۔

انجیل متی میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے آپ کے متعلق فرمایا کہ

> میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورتوں سے پیدا ہوئے ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ہوا ۔

رینان نے اپنی کتاب (Life of Jesus) میں لکھا ہے کہ "یوحنا" کی تعلیم کا مرکز (Judea) تھا لیکن اس کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا اور حضرت عیسیٰ ان سے آ کر ملے تھے ۔ اس کے بعد اس نے لکھا ہے کہ "یوحنا" اور حضرت عیسیٰؑ نے فلسطین کے صحرا میں ایک عجیب انقلاب انگیز نظام قائم کیا تا آنکہ ۲۹ء میں "یوحنا" کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے وطن کی طرف مراجعت فرمائی ۔

ی د ی

اَلْیَدُ ۔ ہاتھ کو کہتے ہیں ۔ مؤنث استعمال ہوتا ہے ۔ اسکی جمع اَیْدٍ ہے ۔ لیکن اس لفظ کا استعمال اسقدر متعدد معانی میں ہوتا ہے جنکی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں ۔ جیسے ہمارے ہاں "ہاتھ" کا استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً جاہ اور وقار ۔ قوت و اقتدار ۔ غلبہ و تسلط ۔ ملکیت ۔ مددگار ۔ امداد اور فریاد رسی ۔ احسان و انعام ۔ حفاظت و صیانت ۔ حذاقت و مہارت ۔ دوسری طرف یہ لفظ

ندامت وشرمندگی۔ ذلت و انقیاد کے لئے بھی آتا ہے۔ قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرام کے متعلق ہے کہ وہ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ تھے (۳۸/۴۵)۔ یعنی قوت اور بصیرت دونوں کے مالک۔ دوسری طرف ان کے مخالفین کے متعلق کہا ہے کہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ (۱۴/۹) انہیں بات کرنے سے روک دیا جائے۔ ابن قتیبہ نے ان معانی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ وہ غیظ و غضب میں اپنے ہاتھ کاٹنے لگتے ہیں***۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ آئیگا سیاق و سباق کے اعتبار سے اس کے معنی کئے جائینگے۔ قرآن کریم میں بَيْنَ يَدَيْهِ کا محاورہ متعدد بار آیا ہے۔ اسکے لفظی معنی ہیں اس کے دونوں ہاتھوں کے درمیان۔ یعنی سامنے*۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (۲/۹۷) کہا ہے۔ لہذا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ کے معنی ہیں "جو اس کے سامنے ہے"۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو ان اخلاقی اقدار کا مصدّق کہا ہے جو دنیا کے پاس اس سے پہلے آئی تھیں۔ اور ان میں سے بعض، نزول قرآن کے وقت بھی ان لوگوں کے پاس موجود تھیں۔ مثلاً جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ وغیرہ۔ قرآن کریم ان کی اس قسم کے اقدار کا مصدق تھا۔ وہ اہل کتاب کی کتابوں کی تصدیق نہیں کرتا تھا، وہ انہیں خود محرف قرار دیتا تھا۔"مصدق" کے صحیح مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان (ص ۔ د ۔ ق)۔

سورۂ ذاریات میں ہے وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ (۵۱/۴۷)۔ ہم نے آسمان (فضائی کروں یا خارجی کائنات) کو قوت و اقتدار کے ساتھ بنایا ہے۔ [نیز دیکھئے عنوان ا ۔ ی ۔ د]

سورہ توبہ میں ہے کہ اہل کتاب اسلامی نظام میں جزیہ دیں عَنْ يَدٍ (۹/۲۹) اس نعمت و آسائش کے بدلے میں جو انہیں اطمینان و سکون کے ساتھ رہنے میں حاصل ہے**۔

سورہ فرقان میں ہے يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ (۲۵/۲۷) اس کے معنی، غم و غصہ میں دانتوں سے ہاتھ چبانے کے ہیں۔ اعمالِ انسانی کے متعلق بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ (۴/۹۵) کئی مقامات پر آیا ہے۔ یعنی جو کچھ ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی ہاتھ نہیں بلکہ خود

*تاج و محیط۔ **راغب۔ (بحوالہ ۔ غریب القرآن میرزا ابوالفضل)

***القرطبی ج/۱ صفحہ ۲۳۵

انسان کے ہیں ۔ سورہ بقرہ میں ہے وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (۲/۱۹۵) اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو ۔ سورہ حجرات میں ہے لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۴۹/۱) اس سے مراد احکام اور فیصلے ہیں ۔

(سَارِقٌ کے قطع يَد کے لئے دیکھئے عنوان ق ۔ ط ۔ ع ۔ اور يَد بَيْضَاء کے لئے دیکھئے عنوان ب ۔ ی ۔ ض اور ض ۔ م ۔ م) ۔

ی س ر

اَلْيَسَرُ ۔ اَلْيَسْرُ ۔ نرمی ۔ اَلْيُسْرُ ۔ سہولت ۔ آسانی ۔ فراخی ۔ کشائش آسودگی، تونگری ۔ معیشت کی طرف سے فارغ البالی ۔ بہتات ۔ (عُسْرٌ بمعنی تنگی کی ضد ہے)* ۔ يَسِرَ وَ يَسُرَ الْاَمْرُ ۔ معاملہ آسان اورسہل ہوا ۔ يَسَّرَ ۔ اس کام کو آسان یا سہل کر دیا ۔ تَيَسَّرَ واسْتَيْسَرَ ۔ آسان ہوا ۔ بآسانی مہیا ہوا * ۔ (۲/۴۹ : ۳/۲۰) ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کھل جانا اور ہلکا پھلکا ہونا لکھے ہیں ۔ اَلْيَسَارُ ۔ بایاں ہاتھ ۔ بائیں جانب (يَمِيْنٌ کی ضد ہے) * ۔ اليَسِيْرُ والمَيْسُوْرُ ۔ آسان ۔ سہل ۔ اَلْيَسِيْرُ ۔ تھوڑی چیز** ۔ اَلْمَيْسَرَةُ وَالْيَسَارُ ۔ تونگری ۔ آسودگی ۔ غنی ** ۔ (۲/۲۸۰) ۔ اَلْمَيْسِرُ ۔ قمار ۔ جوا ۔ وہ اونٹ جو جوئے میں ہارا یا جیتا جاتا تھا * ۔

قرآن کریم میں يُسْرٌ بمقابلہ عُسْرٌ آیا ہے (۲/۱۸۵) ۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے ۔ فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَيْسُوْرًا (۱۷/۲۸) ۔ ان سے نرمی سے بات کرو ۔ ایسی بات جو انہیں گراں نہ گذرے ۔ سورہ احزاب میں يَسِيْرًا (۳۳/۱۴) کے معنی ہیں کم از کم ۔ بہت تھوڑے ۔ قلیل تعداد میں ۔ "کم وقت کے لئے یا کم تعداد میں" دونوں معنی ہو سکتے ہیں ۔

سورہ بقرہ میں خَمْرٌ اور مَيْسِرٌ کے متعلق ہے فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲/۲۱۹) ۔ مَيْسِرٌ يُسْرٌ سے ہے جسکے بنیادی معنی آسانی ہیں ۔ اگرچہ عربوں میں مَيْسِرٌ ہر قسم کے جوئے کو کہتے ہیں ۔ اس جوئے کو بھی جو تیروں سے ایک خاص طریق سے کھیلا جاتا تھا اور جس میں اونٹ کے گوشت کے حصے بخرے کئے جاتے تھے ۔ لیکن اس کے مفہوم کو اسکے بنیادی معانی کے پیش نظر مقید نہ رکھا جائے تو ہر وہ مال جو انسان کو آسانی سے ہاتھ آجائے مَيْسِرٌ ہوگا ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

اسکی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اگرچہ اس قسم کی دولت سے فائدے بھی حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اس سے انسانی طبیعت میں جو سستی اور کسل مندی، جو ضعف اور اضمحلال پیدا ہوتا ہے (دیکھئے عنوان ا۔ ث۔ م) اس کے نقصانات ان فوائد کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں جو اس روپے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس قسم کی دولت کو رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ کہکر اس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ($\frac{5}{90}$)۔ اور اسے قرآن کریم کے نظام صلٰوۃ کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا موجب بتایا گیا ہے ($\frac{5}{91}$)۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ انسان محنت اور کوشش سے کمائے اور جو کچھ اپنی ضروریات سے زائد ہو اسے نوع انسانی کی پرورش کے لئے عام کر دے ($\frac{2}{219}$)۔ ظاہر ہے کہ جو دولت انسان کو آسانی سے بیٹھے بٹھائے ہاتھ آجائے وہ اسے محنت اور مشقت کا عادی نہیں رہنے دیگی اور اسطرح اس کی صلاحیتوں میں اضمحلال پیدا کرنے کا موجب بن جائیگی، جیسے ہر رئیس زادے کی حالت ہوتی ہے کہ وہ خود کمانے کا اہل ہی نہیں رہتا۔ اس طرح حاصل شدہ دولت سے انسان میں دولت کی ہوس اور زر پرستی کا جذبہ بڑھ جاتا ہے اور وہ دوسروں کو دینے کی بجائے زیادہ سے زیادہ اپنے لئے حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ جیسے ہر قمار باز کی کیفیت ہوتی ہے۔ لہذا ہر وہ دولت جو آسانی سے (بغیر محنت و مشقت) ہاتھ آجائے قرآنی تعلیم کی روح کے مطابق مَيْسِرٌ میں داخل ہے۔ بالخصوص عصر حاضر کی "تجارت" جو کہنے میں تجارت ہے لیکن درحقیقت میسر ہے۔ اور زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھئے تو سارا نظام سرمایہ داری ہی میسر ہے۔ اس میں ہر سرمایہ دار کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور اس کا پھل یہ لے جائے۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ زندگی کی سہولتیں اور آسانیاں حاصل کرنا چاہتے ہو تو مشکلات کا سامنا کرو۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ($\frac{94}{5}$)۔ جو قوم (یا فرد) مشکلات کا سامنا کرنے سے گھبراتی ہے اسے وہ آسانیاں حاصل نہیں ہو سکتیں جو صحیح خوشگواریوں کا موجب بنتی ہیں۔ البتہ اسے وہ يُسْرٌ حاصل ہوجاتا ہے جو اثم (اضمحلال اور ضعف) کا موجب بنتا ہے اور تباہی و بربادی کی طرف لے جاتا ہے۔

یعقوب علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسحٰقؑ۔ اور حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ تھے۔ اللہ تعالٰی نے آپ کا ذکر زمرہ انبیائے کرامؑ میں

کیا ہے .... وَمَا أُنْزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ .... (۲/۱۳۶) - آپ کا لقب إِسْرَائِيلُ (یعنی مردِ خدا) تھا - اسی نسبت سے آپ کی اولاد (در اولاد) بنی اسرائیل کہلائی - قرآن کریم نے بھی آپ کو اس لقب سے یاد کیا ہے - مثلاً سورہ آل عمران میں ہے .... إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ .... (۳/۹۳) - ''سوائے اس کے جسے اسرائیل نے اپنے آپ پر حرام قرار دے لیا تھا'' - اور سورہ مریم میں ہے مِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ .... (۱۹/۵۸) - ذریتِ ابراہیم اور اسرائیل سے''۔

حضرت یوسفؑ آپ کے بیٹے تھے -

یَعُوْق

قوم نوح کا بت تھا (۷۱/۲۳) - عرب کے لوگ اس بت کے نام سے بخوبی متعارف تھے - چنانچہ قبیلہ بنو ہمدان اس نام کے ایک بت کی پرستش کیا کرتا تھا -

یَغُوْث

قوم نوح کا بت تھا (۷۱/۲۳) - عرب کے لوگ اس بت کے نام سے بخوبی متعارف تھے - چنانچہ خود عرب میں قبیلہ بنو مراد کے لوگ اس نام کے ایک بت کی پرستش کیا کرتے تھے -

یَقْطِیْن

اَلْیَقْطِیْنُ - وہ بیل جو زمین پر پھیل جائے - جیسے خربوزہ، تربوز، کدو کی بیلیں - بعض نے کہا ہے کہ یَقْطِیْنٌ کدو کی بیل کو کہتے ہیں - نیز اَلْیَقْطِیْنَةُ کدو کو کہتے ہیں *- صاحب تاج العروس نے یہ بھی کہا ہے کہ ہر وہ پودا جو ایک سال کے اندر ہی پیدا ہو کر ختم ہو جائے یَقْطِیْنٌ کہلائیگا - نیز ہر بڑا پتہ یَقْطِیْنٌ کہلائیگا - قرآن کریم میں شَجَرَةً مِنْ یَقْطِیْنٍ (۳۷/۱۴۶) آیا ہے - اس سے مراد ہے چوڑے پتوں والا پودا جو سایہ دیتا ہو -

---

*تاج و راغب و محیط -

ی ق ظ

اَلْیَقْظَۃُ - بیداری - یہ نَوْمٌ (نیند) کی ضد ہے - اس میں ہوشیاری کا مفہوم بھی ہوتا ہے - رَجُلٌ یَقْظٌ وَ یَقِظٌ - بیدار آدمی - اسکی جمع اَیْقَاظٌ آتی ہے، بمقابلہ رُقُوْدٌ (۱۸/۱۸) - اَبُوالْیَقْظَانِ - مرغ کو کہتے ہیں *-

ی ق ن

یَقِنَ الاَمْرَ وَاَیْقَنَہٗ وَاسْتَیْقَنَہٗ وَتَیَقَّنَہٗ - اس نے معاملہ کو جانا اور اسکی حقیقت معلوم کر لی - یَقْنٌ وَیَقَنٌ - کسی بات کا واضح اور ثابت ہو جانا - یَقِیْنٌ - شَکٌّ کی ضد ہے - یعنی شک کا زائل ہو کر علم و تحقیق کے ساتھ کسی امر کا پایۂ ثبوت تک پہنچ جانا *- مَوْتٌ کو بھی یَقِیْنٌ کہتے ہیں کیونکہ ہر مخلوق پر اس کا آنا یقینی ہے اور ٹھوس واقعات ہر روز اسکی شہادت دیتے ہیں *-

سورہ انعام میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق مذکور ہے کہ وہ کائناتی قوانین (مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ) کے مشاہدہ کے بعد یَقِیْنٌ کے درجہ تک پہنچ گئے (۶/۷۹) - سورہ حجر میں جہاں فرمایا کہ وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ (۱۵/۹۹) - تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تو اپنے نشوو نما دینے والے کے قانون ربوبیت کا کامل اتباع کئے جا، حتکہ کہ تیرا دعوی (کہ اس نظام کے نتائج حیات بخش اور خوشگوار ہونگے) ایک ٹھوس واقعہ کی شکل میں سامنے آجائے (نیز ۷۴/۴۷) -

لہذا اِیْمَانٌ کے معنی ہونگے کسی پر اعتماد کرکے اسکی بات کو صحیح مان لینا اور یَقِیْنٌ کے معنی ہونگے علم و تحقیق کے بعد اس بات کا ثابت ہو جانا اور اس کا ٹھوس واقعہ کی شکل میں سامنے آجانا - لَتَرَوُنَّھَا عَیْنَ الْیَقِیْنِ (۱۰۲/۶) - تم اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لوگے - قرآن کریم نے جب مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ آخرت (مستقبل) پر یقین رکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی سعی و عمل کے ٹھوس نتائج ان کے سامنے آجاتے ہیں - یعنی پہلے وہ اپنے نظام کے ان دیکھے نتائج پر ایمان لاتے ہیں (۲/۳) - اس کے بعد جب وہ اس نظام کو قائم کر لیتے ہیں تو اس کے بدیہی نتائج مرئی اور محسوس شکل میں ان کے سامنے آجاتے ہیں - اس طرح ان کا ایمان، یقین میں بدل جاتا ہے (۲/۴) - یہ ہیں مستقبل پر یقین کے معنی - اسی

*تاج -

یقین سے انسان اس امر پر ایمان لے آتا ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی (آخرت) بھی ایک حقیقت ثابتہ ہے ۔

ہم نے " ایمان " اور " یقین " میں جو امتیازی خط کھینچا ہے وہ دونوں الفاظ کا الگ الگ مفہوم سمجھانے کے لئے ہے ۔ ورنہ ایمان ، خود یقین ہی کا نام ہے ۔ اور یقین ، ایمان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا ۔ یہ دونوں مرادف المعنی بھی ہو جاتے ہیں ۔ یا آپ کہہ سکتے ہیں کہ " یقین " " ایمان " کے نتائج کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے ۔

ی م م

اَلتَّیَمَّامُ ۔ قصد کرنا * ۔ اَلْیَمُّ ۔ دریا ۔ سمندر کو بھی کہتے ہیں * ۔ (۲۰/۳۹ ; ۲۸/۷ ; ۲۸/۳۰) ۔

اَلتَّیَمُّمُ ۔ کسی کام کا ارادہ کرنا ، قصد کرنا * ۔ (۲/۲۶۷ ; ۳/۴۴ ; ۵/۶) (دیکھئے عنوان م ۔ س ۔ ح)

ی م ن

اَلْیُمْنُ ۔ برکت ۔ اَلْمَیْمَنَةُ ۔ برکت ۔ دائیں جانب ۔ اَلْیَمَنُ ۔ دائیں جانب ۔ اَلْیَمِیْنُ ۔ دایاں ہاتھ ۔ دائیں جانب ۔ (یَسَارٌ کی ضد ہے) ۔ نیز اس کے معنی قوت کے ہیں ** ۔ یَمِیْنٌ ۔ جمع اَیْمَانٌ ۔ قسم ۔ اس لئے کہ عرب قسم کھاتے وقت اپنا دایاں ہاتھ دوسرے کے دائیں ہاتھ پر مارتے تھے * ۔

سورہ کہف میں ہے ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ (۱۸/۱۸) ۔ یعنی دائیں بائیں ۔ سورہ قصص میں ہے مِنْ شَاطِیءِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ (۲۸/۳۰) ۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ " وادی کے دائیں کنارے سے " اور یہ بھی کہ " مبارک وادی کے کنارے سے " ۔

قسم کے معنوں میں یہ لفظ (اَیْمَانُکُمْ) متعدد مقامات پر آیا ہے ۔ (مثلاً ۲/۲۲۴) ۔ نکاح کے لئے عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ کے الفاظ آئے ہیں (۴/۳۳) ۔ یعنی تمہارے عہد و پیمان بندھے اور مستحکم ہوئے ۔

برکت کے لئے اَصْحَابَ الْیَمِیْنِ (۵۶/۲۷) ۔ اور اَصْحَابُ الْمَیْمَنَةِ (۵۶/۸) آیا ہے ۔ لیکن اس کے معنی " دائیں جانب والے " بھی ہو سکتے ہیں ۔

* تاج و محیط ۔ ** ابن قتیبہ ۔ (القرطین ج/۲ ۔ صفحہ ۱۸۰)

نیز اَلطُّوْرِ الْاَیْمَنِ (۱۹/۵۲) - زور اور قوت کے معنوں میں سورہ صفٰت میں ہے فَرَاغَ عَلَیْهِمْ ضَرْبًا بِالْیَمِیْنِ (۳۷/۹۳) - (ابراہیمؑ) نے ان بتوں پر پوری قوت سے بھرپور وار کیا۔ اسی سورۃ میں ذرا پہلے ہے قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ (۳۷/۲۸) - وہ کہینگے تم ہمارے پاس بڑی قوت اور زبردست ذرائع کے ساتھ آیا کرتے تھے - (اور اسطرح ہمیں حق کے راستے سے روک دیا کرتے تھے)۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے - مَامَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ - اس کے لفظی معنی ہیں " جن کے مالک تمہارے دائیں ہاتھ ہو چکے " - بعض مقامات پر اس کے معنی ہیں وہ لوگ جو کسی کے ماتحت کام کریں - کسی کے تابع فرمان ہوں - (مثلاً ۳/۳۹ میں) - لیکن بعض مقامات پر اس کے معنی غلام اور لونڈیاں ہیں - سورہ نور میں ہے وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ (۲۴/۳۳) - تمہارے غلام اور لونڈیوں میں سے جو تم سے مکاتبت کریں - یعنی ایک معاہدہ کے تحت آزادی کی تحریر مانگیں -

اسلام سے پہلے عرب میں غلاموں اور لونڈیوں کا عام رواج تھا - غلام باہر کا کام کاج کیا کرتے تھے اور لونڈیوں کو وہ لوگ گھروں میں ڈال لیتے تھے - یہ وہ معاشرہ تھا جس میں اسلام نمودار ہوا - جب یہ لوگ مسلمان ہوئے تو ان کے ہاں غلام اور لونڈیاں موجود تھے - اسلام غلامی کو مٹانے کے لئے آیا تھا لیکن اگر وہ ان غلاموں اور لونڈیوں کو (جو اُسوقت موجود تھے) یک لخت آزاد کر دینے کا حکم دیتا تو اس سے معاشرہ کا توازن بگڑ جاتا - یہ جوان لونڈیاں (اتنی بڑی تعداد میں) جب خاوندوں کے بغیر آزاد کر دی جاتیں تو وہ معاشرہ کے لئے سخت خرابیوں کا موجب بن جاتیں - اسلام نے اس صورت حالات کو برقرار رہنے دیا اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر دیا - لیکن جو غلام اور لونڈیاں اس وقت موجود تھیں ان کے متعلق ایسے احکام دئے کہ وہ رفتہ رفتہ آزاد ہو کر معاشرہ کا جزو بنتے جائیں اور جب تک غلام رہیں ان سے انسانوں جیسا سلوک کیا جائے - مَامَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ کے ماتحت لونڈی غلاموں کے متعلق قرآن کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ انہی لونڈی غلاموں کے متعلق ہے - ان کے بعد لونڈی غلاموں کا سلسلہ ہی بند ہو جانا تھا اسلئے یہ احکام بھی نافذ العمل نہیں رہنے تھے - البتہ اگر اس دور کے بعد کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے جس میں کوئی ایسی قوم مسلمان ہو جائے جن میں پہلے سے لونڈی غلام موجود ہوں تو ان غلاموں پر یہی احکام نافذ ہو جائینگے -

مَامَلَكَتْ" اَيْمَانُكُمْ" کی مندرجہ بالا تشریح کی روشنی میں قرآن کریم کے مختلف مقامات کو دیکھئے ۔ بات صاف ہو جائے گی کہ یہ احکام اُسوقت کے لونڈی غلاموں کے متعلق ہیں ۔ اور بس ۔ مثلاً وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ (۷۰:۳۰ – ۲۹:۳۰) ۔ وہ لوگ جو اپنی پاکدامنی کی حفاظت کرتے ہیں اور صرف اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہیں یا ان لونڈیوں کے پاس جن کے وہ مالک بن چکے ہیں (قرآن کریم میں ہر جگہ یہ لفظ ماضی کے صیغے میں آیا ہے) ۔ مزید تفصیل کے لئے عنوان (م ۔ ل ۔ ک) دیکھئے ۔

ہماری بدبختی کہ مسلمان سلاطین نے غلاموں اور لونڈیوں کا دروازہ کھول لیا اور قرآن کریم کی انہی آیات (اور موضوع روایات) کو اپنے عمل کے جواز کے لئے بطور سند پیش کر دیا ۔ قرآن کریم پر اس سے بڑا اتہام اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس سے غلامی کا جواز ثابت کیا جائے ۔

ی ن ع

يَنَعَ الثَّمَرُ ۔ يَيْنَعُ ۔ يَنْعاً ۔ پھل کا پک کر بالکل تیار اور توڑنے کے قابل ہو جانا ۔ اَلْيَنِيْعُ ۔ پوری طرح پکا ہوا پھل ۔ اليانع ۔ پختہ پھل ۔ سرخ *۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَيَنْعِهٖ (۶/۱۰۰) پھل کا پکنا ۔ اس کا سرخ ہونا ۔

یہود

قوم بنی اسرائیل ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان "موسیٰ" اور عنوان (ھ ۔ و ۔ د)

یوسف علیہ السلام

حضرت ابراہیم کے بیٹے حضرت اسحٰق ۔ آپ کے بیٹے حضرت یعقوب اور ان کے بیٹے حضرت یوسف ۔ قرآن کریم نے آپ کا تذکرہ جلیلہ ایک ہی سورۃ میں مسلسل بیان کیا ہے (اور کسی نبی کا تذکرہ اس طرح مسلسل بیان نہیں ہوا) ۔ بچپن میں بھائیوں نے انہیں ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا (۱۲/۱۵) ۔ جہاں سے اُنہیں ایک قافلے والے مصر لے گئے ۔ وہاں آپ (مختلف مراحل طے کرنے کے بعد) ، مملکت کے اقتدار و اختیار کے مالک ہو گئے (۱۲/۵۶؛ ۱۲/۱۰۱)

*تاج و محیط و راغب

اور اپنے والدین اور دیگر اہل خاندان کو بھی وہیں بلا لیا۔ اس طرح بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوبؑ کی اولاد) کنعان سے مصر کی طرف منتقل ہو گئی۔

سورہ انعام میں حضرت یوسفؑ کا نام انبیاء کرام کے زمرہ میں آیا ہے۔ ... دَاوُدَ وَ سُلَیْمَانَ وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْسُفَ وَ مُوْسٰی و هٰرُوْنَ .... (۶/۸۵)۔ اور سورہ مؤمن میں، دربار فرعون کا مردِ مؤمن اپنی تقریر میں حضرت یوسفؑ کا ذکر ایک رسول کی حیثیت سے کرتا ہے۔ (۴۰/۳۴)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنا پیغام جو بینات پر مشتمل تھا قوم مصر تک پہنچایا تھا۔

(حضرت یوسفؑ کے کوائف حیات اور ان کے حسنِ سیرت کی داستانِ نور پاش، میری کتاب ''جوئے نور'' میں ملیگی)۔

ی و م

یَوْمٌ۔ دن۔ طلوع آفتاب یا طلوع فجر صادق سے غروب آفتاب تک کا وقت۔ یہ لفظ عربوں کے ہاں مطلقاً وقت اور زمانہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ دن اور رات کی اس میں کوئی قید نہیں ہوتی۔ صبح اور شام کی گردش بھی یَوْمٌ ہے (یعنی ایک دن)۔ سال بھی۔ ایک صدی بھی۔ ہزار سال اور پچاس ہزار سال بھی۔ وَقْتٌ اور سَاعَۃٌ کی طرح یَوْمٌ کے بعد بھی اِذٍ بڑھا دیا جاتا ہے۔ اور یَوْمَئِذٍ کے معنی تقریباً وہی ہوتے ہیں جو وَقْتَئِذٍ اور سَاعَتَئِذٍ کے ہوتے ہیں*۔ گویا وَقْتٌ۔ سَاعَۃٌ اور یَوْمٌ ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔ یَوْمٌ کی جمع اَیَّامٌ ہے*۔ ابن فارس نے یَوْمٌ کے معنے دن بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ استعارۃً یہ لفظ امر عظیم کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔

نیز اس کے معنی ہیں حکومت اور دولت اور زمانہ' ولایت**۔ تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ (۳/۱۳۹) میں اَیَّامٌ کے معنی حکومت و سلطنت کے لئے گئے ہیں**۔

اَیَّامٌ۔ وقائع (یعنی تاریخ کے ناقابل فراموش واقعات یا معرکے) کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اَیَّامُ الْعَرَبِ کے معنی وَقَائِعُ الْعَرَبِ ہیں**۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اَیَّامُ اللهِ انہی معانی میں آیا ہے۔ مثلاً وَذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰمِ اللهِ (۱۴/۵)۔ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے

*محیط۔ **تاج۔

معرکہ کے لئے آیا ہے۔ یہ اِنْتِقَامُ اللہِ اس لئے وقوع پذیر ہوتے ہیں لِیَجْزِیَ قَوْمًا بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۴۵/۱۴)۔ تاکہ کسی قوم کو اس کے کئے کی سزا مل جائے۔ اسی لئے بعض اہل لغت نے اَیَّامٌ کے معنے عقوبتیں اورسزائیں بھی کئے ہیں*۔

کائنات میں خدا کا قانون ارتقاء جاری و ساری ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ خدا اپنے امر (ابتدائی قانون مشیت۔ دیکھئے عنوان ش۔ ی۔ أ) کےمطابق جب کسی اسکیم کو بروئے کار لانے کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے اس کا مکمل پلان اپنے عالم امر (السماء) میں مرتب کرتا ہے۔ پھر اس پلان کو عملاً متشکل کرنے کے لئے اس کی ابتداء پست ترین نقطہ سے کرتا ہے۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ۔ پھر وہ اسکیم اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اوپر کو اٹھتی ہے۔ یہ منازل ایک ایک یَوْمٌ میں طے ہوتے ہیں جو انسانی حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲/۵) ظاہر ہے کہ یہاں "یوم" سے مراد دور یا مدت یا زمانہ یا تدریجی مرحلہ ہے۔ یہی دور بعض اوقات پچاس ہزار سال کا بھی ہوتا ہے (۷۰/۴)۔ علمائے طبقات الارض یا محققین نظریہ ارتقاء اس کی شہادت دینگے کہ یہ تدریجی مراحل کتنے کتنے طویل المیعاد ہوتے ہیں۔

لہذا قرآن کریم میں جہاں یَوْمٌ کا لفظ آئے گا تو ہر جگہ اس کے معنے اس "دن" کے نہیں ہوں گے جو چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے۔ اس کے معنی وقت (Time) یا دور (Period) یا زمانہ (Age) یا کسی خاص مدت یا حالت (Stage) کے ہوں گے۔ مثلاً مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (۱/۳) کے معنے ہونگے وہ دور جس میں تمام مخالف قوتیں شکست کھا جائیں اور غلبہ و اقتدار صرف قانون خداوندی کا رہ جائے۔ یا وہ دور جس میں انسانی اعمال کے نتائج عدل و انصاف کی رو سے مرتب ہوں۔ یا ظہور نتائج کا وقت۔ وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ (۸۲/۱۹)۔ جس دور میں حکومت صرف خدا کےقانون کی ہوگی۔ (مزید تصریح د۔ ی۔ ن کے عنوان میں دیکھئے)۔

یونس علیہ السلام

حضرت یونسؑ انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ ان کا عبرانی نام یوناہ تھا جو عربی میں آ کر یونس ہو گیا۔ تورات میں ان کا نوشتہ "کتاب یوناہ"

*تاج۔

کے نام سے موجود ہے ۔ ان کا زمانہ اندازاً ۸۰۰ ق ۔ م کا قیاس کیا جاتا ہے ۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۔۔۔۔ (۳۷/۱۳۹) ۔

تورات (صحیفہ یوناہ) میں آپ کے متعلق تفصیلی تذکرہ آیا ہے ۔ لیکن (تورات کے عام انداز کے مطابق) اس میں بہت کچھ ایسا بھی ہے جو خدا کے کسی رسول کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا ۔ قرآن کریم نے اتنا ہی بتایا ہے کہ آپ اپنی قوم سے خشمناک ہو کر کسی دوسری طرف جانے کے ارادہ سے نکلے ۔ راستہ میں کشتی میں سوار ہو گئے ۔ کشتی طوفان میں پھنس گئی ۔ ملاحوں نے (غالباً) فیصلہ کیا کہ کچھ سواریوں کو دریا میں پھینک دیا جائے تاکہ کشتی کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور باقی مسافر محفوظ رہ جائیں ۔ آپ کو بھی حوالہ دریا کر دیا گیا جہاں آپ کو ایک بڑی مچھلی نے دبوچ لیا ۔ لیکن آپ صحیح و سلامت کنارے تک آپہنچے ۔ دیکھئے (۲۱/۸۷-۸۸ ؛ ۳۷/۱۳۹-۱۴۶) ۔

حضرات انبیاء کرام[ؑ] کا یہ عام طریق رہا ہے کہ جب وہ دیکھیں کہ ان کا اپنا وطن ان کے نظام کے لئے سازگار نہیں تو وہ وہاں سے ہجرت کر کے اس علاقے کیطرف چلے جاتے تھے جہاں کی فضا ان کے مشن کے لئے مساعد ہوتی تھی ۔ لیکن یہ ہجرت خدا کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق ہوتی تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس[ؑ] نے اپنی قوم سے ، اپنے اجتہاد کے مطابق ، ہجرت کر لی اور ان کا یہ فیصلہ خدا کے پروگرام کے مطابق نہیں تھا ۔ قبل از وقت تھا ۔ اس لئے وہ بعد میں اس پر نادم ہوئے (۳۷/۱۴۲) ۔ نبی اکرم[ؐ] سے کہا گیا کہ آپ نے صاحب حوت کی طرح نہ ہوجانا (۶۸/۴۸) [نیز دیکھئے عنوان ا ۔ ب ۔ ق]

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ جس بستی (نینوا) کیطرف آپ کو رسول بنا کر بھیجا گیا تھا اسکی آبادی ایک لاکھ سے بھی اوپر تھی ۔ (یعنی اس زمانہ کے اعتبار سے وہ بہت بڑا شہر تھا) (۳۷/۱۴۷) ۔ انہوں نے آپ کی دعوت سے انکار کیا لیکن قبل اس کے کہ ان پر عذاب آ جاتا ، وہ ایمان لے آئے اور اس طرح انہیں مہلت مل گئی (۳۷/۱۴۸) ۔ اہل نینوا اس وقت تو تباہی سے بچ گئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد (قریب ۶۹۰ ق ۔ م میں) انہوں نے پھر وہی شیوہ اختیار کر لیا ۔ بنی اسرائیل کے ایک اور نبی نے (جن کا ذکر قرآن کریم نے نہیں کیا لیکن یہود کی روایات میں ان کا پتہ ملتا ہے) انہیں خدا کے عذاب سے متنبہ کیا ۔ وہ باز نہ آئے تو ایک طرف سے اہل بابل نے ان پر حملہ کیا اور دوسری طرف سے دریا میں سخت سیلاب آیا ۔ اور اس طرح نینوا کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹ گیا ۔

قرآن کریم نے آپ کو ذَا النُّوْنِ (۲۱/۸۷) اور صَاحِبِ الْحُوْتِ (۶۸/۴۸) کہہکر بھی پکارا ہے ۔

لِلّٰہ الحمد

کہ

لغات القرآن کی چوتھی (اور آخری) جلد بھی مکمل ہو گئی ۔ اس کے بعد اس کا تتمہ آپ کے سامنے آئیگا جس میں ' پوری لغات پر نظر ثانی کے بعد ' ضروری اضافے اور ترمیمات کی گئی ہیں ۔

اللہ کا شکر ہے

کہ

اس لغات کی تکمیل سے میری عمر بھر کی محنت محفوظ ہو گئی ۔ اب "مفہوم القرآن" کی طباعت کا سلسلہ شروع ہو گا ۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ لغات القرآن اور مفہوم القرآن کی موجودگی میں ' قرآن کریم کے سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہیگی ۔

یہ بہرحال

ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو اور خطا کا ہر وقت امکان ہوتا ہے ۔ مینے قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہ ایک نئی طرح ڈالی ہے ۔ دیگر ارباب ذوق اور علم دوست حضرات ' مزید غور و تدبر سے ' اسے بہتر بنا سکتے ہیں ۔ قرآن کریم میں غور و فکر کا سلسلہ تو کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے اس باب میں کسی انسان کا قول بھی حرف آخر نہیں کہلا سکتا ۔ والسلام ۔

پرویز